تاریخی کردار انارکلی: حقیقت یا فسانہ؟

حنا جمشید

Abstract:

Anarkali was a renowned legendary comfort girl during Mughal period. It is said about her that she was supposedly ordered to be buried alive between two walls by Mughal emperor Akbar for having an illicit relationship with the Crown-Prince Salem, later to become Emperor Jahangir. Due to the lack of evidences and sources, the story of Anarkali is considered by some Muslims admirers of Mughals as false. Recently, Dr. Mirza Hamid Baig, a noted fiction writer and critic of Pakistan has published his novel "Anarkali". Quoting some historic evidences, Mirza Hamid Baig claims in his novel that the tragedy of Anarkali was not a false story of history. Such treatise throws light on the historic character and story of Anarkali, which Mirza Hamid Baig creates in his novel to depict the tragedy of Anarkali. This writing inspires the composer of this article to discuss in detail the mysterious character of Mughal history, which was a main focus of great dramatist Imtiaz Ali Taj while creating famous drama Anarkali.

ادب، سیاست اور تاریخ کے مربوط رشتے کی باہمی آمیزش نے اردو ادب کو کئی بیش قیمت تخلیقی فن پارے عطا کئے۔ جو نہ صرف اپنے مخصوص عہد کی نمائندگی کرتے رہے، بلکہ جن کی تخلیقی علویت نے ادب اور تاریخ کے باہمی رشتے کو بھی تقویت دی۔ یہ تاریخی فن پارے آج تک اپنے لکھنے والوں کی پہچان ہیں۔ انہی میں سے ایک ڈراما سید امتیاز علی تاج کا 'انارکلی' ہے۔ انارکلی کے تاریخی کردار پر تحریر کیا جانے والا یہ ایسا لازوال ڈرامہ ہے، جس نے امتیاز علی تاج کو شہرت کی وہ بلندی عطا کی جس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انارکلی ہندوستان کی صدیوں سے چلی آنے والی روایت کا وہ المناک قصہ ہے، جو اپنی تمام تر آزردگی کے ساتھ ہمیشہ تروتازہ رہتا ہے۔ 1931ء میں تخلیق کئے جانے والے اپنے اس ڈرامے میں، سید امتیاز علی تاج انارکلی کے اِس قصے کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، یہ قصہ بے بنیاد ہے۔۔ یہ داستاں نا معلوم کب اور کیونکر ایجاد ہوئی، اور لاہور کی جن تواریخ میں اس کا تذکرہ ہے، ان میں کہاں سے لی گئی۔ خود داستان میں اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر کئی ایسے نقائص ہیں، جن کی وجہ سے یہ قرینِ قیاس نہیں ہوتی۔ لیکن ان امور پر مؤرخ مجھ سے بہتر بحث کر سکتا ہے۔"(1)

چار سو اٹھارہ سال پرانی تاریخِ ہند کی گرد میں، شکوک و شبہات سے جنم لیتا انار کلی کا افسانوی کردار وہ کردار ہے، جس کے بارے میں تب سے اب تک بارہا یہ سوچا گیا کہ 'انار کلی ایک حقیقت تھی یا فسانہ'۔ نامور محقق نور احمد چشتی، جنھیں لاہور اور پنجاب کی آثاریات کے حوالے سے پہلا مقامی تذکرہ نگار بھی مانا جاتا ہے، وہ پہلے مقامی مؤرخ ہیں جو اپنی کتاب ''تحقیقاتِ چشتیہ (2) میں نہ صرف انار کلی کو دربارِ اکبری کی ایک خوبصورت منظورِ نظر کنیز مانتے ہیں بلکہ ملکاؤں اور کنیزوں کی باہمی سازشوں کا نشانہ بننے والی اس مظلوم کنیز کی روایت کو بھی درست قرار دیتے ہیں، لیکن یہاں آخر میں اس قصے میں جھول نظر آتا ہے۔ خاص کہ اس وقت، جب وہ انار کلی کی وفات یا اس کے قتل کے حوالے سے، وہ دو تین آراء پیش کرتے ہیں،(3) ان آراء میں سے کوئی بھی اس قصے کے حوالے سے درست معلوم نہیں ہوتی۔ احوالِ لاہور سے متعلق گوہر نوشاہی یادگارِ چشتی میں لکھتے ہیں کہ :

"چشتی کی بیشتر معلومات سینہ بہ سینہ روایات پر مبنی ہیں اور کسی مستند تذکرے یا سوانحی ماخذ سے غالباً رجوع نہیں کیا گیا۔۔ یوں کئی غیر مستند روایات بھی درج کر دی ہیں۔"(4)

یوں ایک عام قاری کے لیے، انار کلی کا کردار تاریخ کے کئی اسرار سمیٹے مزید مبہم ہو جاتا ہے۔ حال ہی میں نامور محقق اور ادیب مرزا حامد بیگ نے حال ہی میں اپنا نیا ناول 'انار کلی' (سنِ اشاعت 2017ء) پیش کیا ہے۔ مرزا حامد بیگ نے اپنے اس ناول میں، اپنے تحقیقی ماخذات کو بنیاد بناتے ہوئے اور چند تاریخی کتب کے اقتباسات کو بطور شہادت، اپنے دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے، اس امر کا دعویٰ کیا ہے کہ صدیوں سے داستانوں کی زینت بننے والا انار کلی کا کردار کوئی فسانہ نہ تھا بلکہ وہ تاریخ کا ایسا مظلوم کردار تھا، جس کے ساتھ کئے جانے والے ظلم کی بازگشت آج بھی عہدِ اکبری میں سنائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ :

"افسوس کہ عہدِ اکبری کے وقائع نگار اس ضمن میں خاموش ہیں اور عہدِ موجود کے تاریخ دانوں اور تجزیہ نگاروں نے مقبرہ انار کلی اور انار کلی بازار جیسی واضح نشانیوں کو جھٹلاتے ہوئے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔"(5)

اپنے دعوے کو مختلف دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے وہ ایک اور جگہ رقم طراز ہیں کہ :

"مقبرہ انارکلی کے تعویز سے ثابت ہے کہ انارکلی کو زندہ در گور ردینے کا واقعہ 1008ھ بمطابق 1599ء میں پیش آیا۔ لیکن اس واقعے کا ذکر عہدِ اکبری کے کسی مؤرخ نے نہیں کیا۔ بلکہ اُلٹا اٹھارویں صدی عیسوی اور اُس کے بعد کے مسلم مؤرخین نے سانحۂ انارکلی کو جھٹلانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا، یہ نہ جانتے ہوئے کہ اس اندوہناک واقعے کا ذکر، اُسی دور کا ایک برطانوی تاجر ولیم فنچ اپنے سفر نامے Voyage to the East :میں کر گیا ہے۔ ولیم فنچ انارکلی کے زندہ در گور کر دیے جانے کے ٹھیک بارہ برس بعد۔۔1611ء میں لاہور آیا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب لاہور میں گذشتہ پانچ برس سے مقبرۂ انارکلی زیرِ تعمیر تھا۔۔"(6)

یہی نہیں، بلکہ چار برطانوی مؤرخوں اور سیاحوں جیسا کہ ولیم فنچ، اڈورڈ ٹیری، ہربرٹ اور ولیم روسٹر وغیرہ کی ہندوستان کے حوالے سے لکھی گئی تواریخ اور سفر ناموں کے چند جزوی اقتباسات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، وہ اپنے ناول میں اپنے اِس موقف کو درست ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے نظر آتے ہیں، کہ انارکلی تاریخ کا وہ جیتا جاگتا کردار تھا جس کا قتل واستحصال مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اپنی غیرت اور انا کے نام پر کیا۔ ناول کے مطابق سلطنت اور اقتدار کے نشے میں، اپنی منظورِ نظر خوبرو کنیز اور رقاصہ انارکلی کو اپنے بیٹے سلیم سے مبتلائے عشق دیکھ کر، اکبر نے غصے اور اشتعال میں جس ظلم اور جلال کا مظاہرہ کیا، اس کی بربریت آج بھی تاریخ میں رقم ہے۔ اس نے اپنی پیشانی پر لگنے والے "زنا بالمحرمات"(7) کے داغ کی پردہ پوشی کی خاطر انارکلی کو زندہ دیوار میں چنوا دیا، جہاں اس کی موت دم گھٹنے سے ہوئی۔ مرزا حامد بیگ کے نزدیک تاریخ ہیں یہ ابو الفضل جیسے مؤرخین(8) ہی تھے، جو ہمیشہ اپنے مطلق العنان حکمرانوں کے عیوب اور ان کے دامن پر لگے بے گناہوں کے خون کے داغ کی پردہ پوشی کرتے رہے۔ لیکن وقت سے بڑا منصف کوئی نہیں، آج بھی تاریخ کے کٹہرے میں ہندوستان کا شہنشاہ ایک مظلوم کنیز کا مجرم ہے۔

اِس ناول کی قرأت کے دوران قاری کے ذہن میں جس سوال کی تکرار بارہا ہوتی ہے وہ انارکلی کے تاریخی کردار سے ہی متعلق ہے جیسا کہ 'انارکلی حقیقت تھی یا فسانہ؟' اس کی وجہ عہدِ اکبری سے وابستہ متعدد تواریخ، یہاں تک کہ خود شہزادہ سلیم جس نے بعد میں خود کو شہنشاہ نورالدین جہانگیر کہلوایا، کی تزکِ جہانگیری میں بھی انارکلی کے تاریخی کردار اور اس حادثے کے حوالے سے کوئی ذکر موجود نہیں۔ یوں مرزا حامد بیگ کے ناول انارکلی میں ان کے کئے گئے دعوے کو درست ماننے سے قبل ہمیں چند چیزوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ اول یہ کہ مرزا حامد بیگ نے انارکلی کے تاریخی کردار کے حقیقت ہونے کا دعویٰ جس کتاب میں کیا ہے یہ کوئی تحقیق کی کتاب نہیں، بلکہ فکشن

کا ایک روپ ہے۔ ایک ایسا ناول جس میں کہانی کہنے والا اس کی بنت اپنی مرضی سے کرتا ہے، وہ کہانی کا بنیادی خاکہ یا خیال کہیں سے بھی اخذ کرنے میں آزاد ہے۔ وہ اپنے تخیل کی بلند پروازی اور مختلف حالات و واقعات کی کڑیوں کو آپس میں ربط دے کر کا ایک ایسی کہانی تخلیق کرتا ہے جو قاری کے تخیل کو مہمیز دیتی ہے اور اس کی حسِ لطیف کو سرشار کرتی ہے۔ یوں انار کلی کے کردار کو حقیقت یا فسانہ ثابت کرنے کے لیے فکشن کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اسے کہانی کے بیانیے کی ایک عمدہ تکنیک تو سمجھا جا سکتا ہے جو قاری کی توجہ کو یکسر اپنی جانب مبذول کر لے، لیکن انار کلی کے تاریخی کردار سے متعلق ناول کی اس کہانی کو من و عن حقیقت تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کا بذاتِ خود فکشن ہونا ہے۔ خود شہنشاہ اکبر کے عہد سے وابستہ بیشتر تواریخ اکبر اور سلیم کی باہمی چپقلش کا ذکر تو ضرور کرتی ہیں لیکن اس چپقلش کی بنیادی وجہ پر کہیں کھل کر بات نہیں کرتیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی اپنی کتاب مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال میں لکھتے ہیں کہ:

> "آہستہ آہستہ باپ بیٹے کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوتے گئے۔ 1591ء میں بلکہ اس سے بھی کچھ قبل، اکبر کھلے طور پر اپنے بیٹے سے ناخوش ہو گیا اور اگر تھوڑا بہت بھروسہ اکبر کو باقی رہ گیا تھا تو وہ بھی جاتا رہا۔ اس نے سلیم کو شاہی احکامات نظر انداز کرنے پر سخت سست کہا۔ 1591ء میں اکبر پر قولنج کا شدید حملہ ہوا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مرض اس وجہ سے لاحق ہوا کہ سلیم نے خفیہ طور پر اکبر کو زہر دلوایا تھا۔"(9)

ہندوستان کی بیشتر تواریخ میں اکبر اور سلیم کے درمیان تلخ اور کشیدہ تعلقات کی وجہ سلطنت کا اقتدار قرار دی گئی، جسے اکبر اپنے پوتے کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ آخری دنوں میں اکبر پر قولنج کے شدید حملے کے بعد، اس کا علاج جس حکیم نے کیا وہ سلیم کا چہیتا تھا۔(10) تحسین زہرا نے اس حوالے سے اپنی کتاب جنوبی ایشیاء کے مسلم حکمران میں اکبر کی وفات کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> "کہا جاتا ہے کہ سلیم کو اس بات سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ شہزادہ خسرو کے خسر، خانِ اعظم اور ماموں مان سنگھ کی یہ خواہش تھی کہ شراب خور اور پست اخلاق سلیم کو ہٹا کر خوش اخلاق اور خوش مشرب جوان شہزادے خسرو کو سلطنت پر بٹھایا جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اکبر بھی خسرو کو ترجیح دیتا تھا اور اس سازش کی حمایت کرتا تھا۔ سازشوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ جب سلیم باپ کے پاس آئے تو اس کو گرفتار کر لیا جائے لیکن سلیم کو بروقت ضیاء الملک قرونی کے ذریعے اس سازش کی اطلاع مل گئی اور وہ بادشاہ کے پاس نہ گیا۔۔"(11)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرزا حامد بیگ نے اپنے دعوے کے حق میں جن چار برطانوی مؤرخوں اور سیاحوں جیسا کہ ولیم فنچ، اڈورڈ ٹیری، ہربرٹ اور ولیم روسٹر وغیرہ کی ہندوستان کے حوالے سے لکھی گئی تواریخ اور سفر ناموں کے جزوی حصوں کو پیش کیا ہے، ان کے حقیقت پر مبنی ہونے کو کس حد تک درست قرار دیا جائے؟ کیونکہ ناول میں ایک جگہ جہاں ولیم فنچ اور ولیم روسٹر کے، انار کلی کو شہزادہ دانیال کی ماں بتانے پر وہ ان سے خود اختلاف کرتے ہیں۔ اسی طرح ناول میں وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ولیم فنچ وہی لندن کا مشہور تاجر ہے جس کی معرفت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سورت میں ایک چھوٹی سی فیکٹری لگانے کی اجازت ملی تھی اور یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا بھارت میں پہلا قدم تھا۔(12) غور طلب بات یہ ہے کہ یہ وہی سیاح اور تاجر ہیں جنھوں نے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں نو آبادیات کی بنیاد رکھی۔ جنھوں نے ہندوستان پر اپنی حکمرانی کے کئی جواز تراشے اور اس خطے کے حکمرانوں اور باشندوں کی سیاسی و سماجی تاریخ مسخ کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ اس حوالے سے علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر عرفان حبیب کی مرتبہ کتاب شہنشاہ اکبر (13) میں، تاریخ کے پروفیسر ریاض صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> "ہمارے بیشتر مسلمان مؤرخوں نے یہ غلطی بھی کی کہ ۔۔ انھوں نے انگریز مؤرخوں، دانشوروں اور سفر نامہ نویسوں ہی کے موقف پر انحصار کیا اور اسی کو سند جانا حالانکہ یہ موقف سراسر جھوٹ کا انبار ہے، جس کو انھوں نے منطقی جواز فراہم کر کے سچ بنا دیا۔ ان کا مقصد ہندوستان کی بے پناہ دولت، قیمتی وسائل اور خام مال کے ذخائر کو سمیٹ کر برطانیہ منتقل کرنا تھا، سو اپنی حکمرانی کو جواز فراہم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کے منہ پر بھی کالک ملیں۔۔"(14)

اس حوالے سے وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

> "ماضی کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بے سروپا بھی لکھا گیا ہے، جن کی حیثیت محض خیالی کہانیوں کی ہے، مثلاً انار کلی کا قصہ۔ انار کلی تو اصل میں اکبر کی ایک منکوحہ کنیز تھی جو شہزادہ سلیم کے زمانے میں ہی جوانی کی حدود سے گزر چکی تھی۔ انار کلی اور سلیم کی عشقیہ داستان کے خیالی قصے کو انار کلی ڈرامہ لکھ کر امتیاز علی تاج نے خواہ مخواہ سند فراہم کی۔"(15)

مرزا حامد بیگ کا یہ ناول اپنے تئیں جہاں تاریخِ عہدِ اکبری کے کئی تاریک گوشوں پر سوال اُٹھاتا ہے وہیں، امتیاز علی تاج کی تخلیقی دیانتداری کو اُن کے اِس شہرہ آفاق ڈرامے 'انار کلی' کے حوالے سے بھی مشکوک بنا دیتا ہے۔ مرزا حامد بیگ اپنے اس ناول میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو ادب کا معروف ڈرامہ انار کلی، سید امتیاز علی تاج کی اپنی

تخلیق نہیں، بلکہ یہ انبالہ سے تعلق رکھنے والے ایس۔ کے۔ فیروز کا ڈرامہ ہے جو انھوں نے انار کلی (1931ء) کی اشاعت سے دس سال قبل، دارالاشاعت پنجاب کے مالک، مولوی ممتاز علی کو اشاعت کی غرض سے دیا تھا۔ لیکن بعد ازاں ان کے بیٹے امتیاز علی تاج نے اسے اپنے نام سے شائع کروالیا۔ اس حوالے سے وہ اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ :

"1969۔1968ء میں ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ہی نے، اپنے مضمون میں یہ انکشاف کیا تھا کہ ایس۔ کے۔ فیروز نے ۱۹۲۲ء میں اپنا تحریر کردہ ڈراما 'انار کلی' انبالہ سے آکر دارالاشاعت پنجاب کے مالک مولوی ممتاز علی کو اشاعت کی غرض سے دیا تھا۔ جب 1932ء میں دارلاشاعت، لاہور سے انار کلی شائع ہوا تو اُس پر امتیاز علی تاج کا نام دیکھنے کو ملا۔ 1922 میں مولوی ممتاز علی کے بیٹے امتیاز علی تاج گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کے طالبعلم تھے اور پرانے لوگ بتاتے تھے کہ 1922ء میں ہی تاج صاحب نے مشہور کر دیا تھا کہ انھوں نے ڈرامہ انار کلی لکھ لیا ہے۔"(16)

ہم جانتے ہیں کہ سید امتیاز علی تاج کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد سید ممتاز علی اور والدہ محمدی بیگم کا ادب کے حوالے سے ایک نام تھا۔ دارالاشاعت پنجاب اور رسالہ تہذیبِ نسواں اس خاندان کی نمایاں شناخت ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو مرزا حامد بیگ کا یہ دعویٰ کہ ' ڈرامہ انار کلی، امتیاز علی تاج نے نہیں بلکہ انبالہ کے ڈراما نگار ایس۔ کے۔ فیروز نے لکھا ہے' کوئی عام یا معمولی دعویٰ نہیں۔ امتیاز علی تاج کے ڈرامے انار کلی کو شائع ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ اس ڈرامے کی مقبولیت میں آج بھی کوئی شک نہیں، یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرزا حامد بیگ نے ایسی غیر معمولی سرقے کی بحث کو کسی ادبی و تحقیقی مقالے میں ثابت کرنے کی بجائے، ناول کی کہانی کا انتخاب کیونکر کیا؟ مزید یہ بھی کہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے جو دلائل پیش کئے وہ محض ڈاکٹر عبدالعلیم کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے دعوے پر مبنی ہیں۔ ناول میں اس بحث پر دلائل اور شواہد کے حوالے سے خاصی تشنگی موجود ہے، اس حوالے سے اگر امتیاز علی تاج کے ناول انار کلی کے دیباچے کو دیکھا جائے تو یہاں امتیاز علی تاج اس ڈرامے کے حوالے سے محض اتنا کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ :

"میں نے انار کلی 1922ء میں لکھا تھا۔ اس کی موجودہ صورتوں میں تھیٹروں نے اسے قبول نہ کیا۔ جو مشورے ترمیم کے لیے انھوں نے پیش کیے، انھیں قبول کرنا مجھے گوارا نہ ہوا۔ مغربی ڈرامے کے مطالعے کے دس سال پہلے بھی اسے طبع کرانے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور ڈرامے کی حالت دیکھتے ہوئے آج بھی اسے طبع کرانے میں تامل نہیں۔"(17)

امتیاز علی تاج نے یہ ڈراما 1922ء میں پیش کیا، لیکن انھوں نے بھی اس ڈرامے کو پیش کرتے ہوئے، انار کلی کے کردار پر، اس وقت کی تاریخی دستاویزی شہادتوں کے حوالے سے روشنی ڈالنے کی سعی نہ کی۔ امتیاز علی تاج نے، اس ڈرامے کے آغاز میں اپنے پیش کئے گئے دیباچے میں، محض محکمہ آثارِ قدیمہ کی انار کلی کے مقبرے میں آویزاں داستاں کو ہی من گھڑت قرار دینے پہ اکتفا کیا ہے اور یہ بتا کر اپنا دامن اس بحث سے چھڑانے کی سعی کی ہے، کہ یہ ڈراما اُن کے بچپن کی سنی ہوئی روایات کو لے کر، محض اپنے ذاتی تخیل کی کرم فرمائی کی بنیاد پر تخلیق کیا گیا۔

تاہم انار کلی کے تاریخی قصے کے حوالے سے، ان دونوں تخلیقات کو اگر ایک تقابلی اور تنقیدی نظر سے دیکھا جائے، تو امتیاز علی تاج کے ڈرامے انار کلی میں ہمیں انار کلی کا وہ جیتا جاگتا کردار دکھائی دیتا ہے، جس کی مرقع آرائی تاریخ میں کئی بار، مختلف ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کی شکل میں بھی کی گئی۔ اس ڈرامے میں ہمیں ایک زندہ اور متحرک انار کلی نظر آتی ہے۔ جو بات چیت بھی کرتی ہے اور اپنے ارد گرد ہونے والی سازشوں اور وقت کے ساتھ بدلتے رویوں سے بھی خوب باخبر ہے۔ یہاں دآرام، زعفران، ستارہ، مروارید، عنبر اور دیگر خواجہ سراؤں کے درمیان رہنے والی انار کلی، 1599ء کے قلعہ لاہور اور حرم سرا کا حقیقی عکس پیش کرتی ہے۔ اس ڈرامے میں کہانی ایک تسلسل کے ساتھ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور مختلف کرداروں کی پھیلائی گئی سازشوں اور عیاریوں کی بدولت، اس تاریخی المیے تک آن کھڑی ہوتی ہے جو اس ڈرامے کو تاریخ کے ایک مخصوص عہد سے مشروط کر دیتا ہے۔ یوں کرداروں کے باہمی تال میل اور پر اثر مکالموں کی بدولت، ڈرامے کے مختلف مناظر میں، بیک وقت وہ حقیقی لطف اور الم پیدا ہوتا ہے جو اس ڈرامے کو ابدیت اور قبولِ عام کی وہ سند عطا کرتا ہے، جو آج بھی اس کے ذوق و شوق سے پڑھے جانے کا پتہ دیتی ہے۔

مرزا حامد بیگ نے اپنے ناول 'انار کلی' میں، انار کلی کے مظلوم کردار پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں انار کلی کا تاریخی المیہ ایک نئے عصری شعور سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ مرزا حامد بیگ کا یہ ناول، امتیاز علی تاج کے ڈرامے انار کلی کے تاریخی المیے، عہدِ اکبری کے کشیدہ سیاسی تناظر اور اپنے وقت کی مروجہ قدیم روایات کی حدود سے آگے نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ماضی اور حال کی باہمی آمیزش سے تخلیق کیا گیا ایک ایسا تخلیقی فن پارہ وجود میں آتا ہے، جو بیک وقت ماضی اور حال دونوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بظاہر یہ یہ کہانی ایک ایسے فلمی یونٹ کے گرد گھومتی ہے، جو انار کلی پر ایک تاریخی فلم بنانا چاہتا ہے۔ ایک ایسی فلم، جس میں انار کلی کی شخصیت سے جڑے تمام تاریخی ابہام دور کیے جا سکیں۔ ناول کا ہیرو' شہریار مرزا' اپنی سنگ دل طبیعت اور ہیروئین' شازیہ حیات

'خوبصورت اور نرم خو ہونے کی بدولت، عہدِ اکبری کے کردار معلوم ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ناول کے کئی حصوں میں مرزا حامد بیگ بارہا شازیہ کو انار کلی کے نام سے پکارتے ہیں:

"انار کی کلی، نیلی جینز پر مختصر سا سفید مردانہ کرتا پہنے، اور سُرمئی شال کا ڈھاٹا باندھے، مشکی گھوڑے پر سوار، لان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر کاٹ رہی تھی اور زیرِ تکمیل فلم کی ڈانسر لڑکیوں سمیت، فلم یونٹ کے تمام افراد ششدر کھڑے تھے۔"(18)

ناول کا مطالعہ کرتے وقت، قاری کو بارہا اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ اس ناول میں انار کلی کے اور بھی روپ ہیں، جیسا کہ ناول کی ہیروئن شازیہ کا، جسے اپنے انار کلی کے تاریخی فسانے کی مانند اپنی محبت نہ مل سکی، اسی طرح اناول کا دیدہ زیب سرورق بنانے والی عالمی شہرت یافتہ مصورہ صغریٰ ربابی کا، جس نے انار کلی کے قصے کے درد کو حقیقی معنوں میں محسوس کرنے کی سعی کی اور جس کی موت بھی انار کلی کے قصے کی مانند دم گھٹنے سے ہوئی۔ مرزا حامد بیگ کے نزدیک ناول کے سرورق کی تصویر میں رات کی تاریکی میں آزردہ کھڑی انار کلی، جسے اس فسانے کے مطابق آج سے ٹھیک چار سو سال پہلے زندہ درگور کر دیا گیا تھا، نہ صرف اپنے ساتھ ہونے والے تاریخی ظلم اور زیادتی کا زندہ استعارہ بنی نظر آتی ہے بلکہ اس کی مشابہت اپنی تخلیق کرنے والی صغریٰ ربابی سے بھی بہت زیادہ ہے۔ ناول کے ابتدائیے میں مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں کہ:

"افسوس! ۳۰ جنوری، ۱۹۹۴ کو کراچی میں صغریٰ ربابی کو قتل کر دیا گیا۔ اُن کی موت دم گھٹنے سے ہوئی۔ حیران ہوں، انار کلی اور صغریٰ ربابی کے انجام میں بھی کتنی مطابقت ہے۔"(19)

یوں ناول کی فکری معنویت کو آشکار کرتے ہوئے، مرزا حامد بیگ اس تاریخی قصے کو اپنے ناول میں یوں دکھاتے ہیں کہ جیسے شہنشاہ اکبر اور تقدیر کے جبر کا شکار ہونے والی انار کلی، ہر دور میں موجود رہی ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی کا وہ مقدمہ، جو انار کلی تب اپنے عہد میں نہ لڑ پائی، وہ آج بھی ناول کی ہیروئین شازیہ حیات اور ناول کے سرورق کی مصورہ صغریٰ ربابی کے قتل کی صورت تاخیر اور عدم انصاف کا شکار ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مرزا حامد بیگ کا یہ ناول، مغلیہ عہد کی تاریخ اور موجودہ عصری شعور کے باہمی امتزاج سے، ایک جاندار کہانی کی صورت سامنے آتا ہے۔ تاریخ کے ظلم و استحصال کے قصوں سے جڑی ایسی کہانی جس کی بازگشت ہر زمانے اور عہد کی داستانوں میں موجود رہتی ہے۔ اپنے عمدہ اسلوب اور جاندار مکالمات کی بدولت بہت

سے کردار اور واقعات، مصنف کے تخیل کی بنیاد پر ناول میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ جگہوں پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مرزا حامد بیگ نے اپنے تخیل کے زور پر عہدِ اکبری کو پھر سے زندہ کرنے کی سعی کی ہے۔

"وہ دیکھو بلخ سے ہرات اور غزنی سے کابل تک پڑاؤ کرتا ہوا، جلال آباد سے قافلہ آتا ہے۔ اُس گیارہ بارہ برس کی لڑکی نادرہ کو پہچانا تم نے؟ بھاری فراک اور تنگ موہری والی شلوار میں سب سے نمایاں تو ہے۔' شہریار مرزا نے دور تاریک کھائیوں کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔"(20)

ناول میں انارکلی کے تاریخی کردار کو ماضی اور حال سے جوڑتے ہوئے دیکھیں، تو پتہ چلتا ہے کہ مرزا حامد بیگ کے ناول کا یہ متن، اپنے اندر تہہ در تہہ کثیر معنویت سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ ناول انارکلی کے تاریخی قصے کو تاریخ کے ایک عہد کا نہیں، بلکہ عصرِ حاضر کا المیہ بھی قرار دیتا ہے۔ اگرچہ اِس ناول میں انارکلی کا کردار اُس طرح سے متحرک اور فعال نہیں، جیسا کہ ہمیں ڈراما انارکلی میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں نہ تو انارکلی قلعہ لاہور کی بلند و بالا فصیلوں میں، حرم سرا کی کنیزوں کے ساتھ شوخ و چنچل انداز سے پھرتی اور رقص کرتی دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی شہزادہ سلیم اس کے ناز و انداز سے مخمور، کہیں کسی رومانوی منظر میں گم دکھائی دیتا ہے، تاہم یہاں انارکلی کا کردار، تاریخ کی ایک ایسی معصوم اور مظلوم تصویر کی مانند تشکیل پاتا ہے، جو نفرتوں، سازشوں اور اقتدار کی جنگ میں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر سراپا احتجاج ہے۔ جسے ناول کی کہانی کے مطابق بعد از مرگ، اپنے نام پر بنے مزار میں، اپنی آخری آرام گاہ سے بھی بے دخل کر دیا گیا اور جس کی قبر کی شناخت بھی معدوم ہونے کو ہے۔ یوں ایک تاریخی قصے کو بنیاد بناتے ہوئے مرزا حامد بیگ نے اپنے تخیل اور تخلیق کے باہمی امتزاج سے، ایک ایسی کہانی کی تشکیل کی ہے جو انسانی حقوق کی تذلیل پر اپنی آواز خود بلند کرتی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے انارکلی کے تاریخی قصے اور لافانی کردار کو ایک بار پھر تاریخی ابہامات کے مدِّ مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ عصرِ حاضر میں یہ ناول، انارکلی کے تاریخی کردار کی حیاتِ نو ہے۔

حواشی و حوالہ جات:

(1) امتیاز علی تاج، دیباچہ، ناول 'انارکلی'، مکتبہ جدید اردو بازار، جامع مسجد دہلی، دسمبر 1931ء، ص 7

(2) نور احمد چشتی، تحقیقاتِ چشتی، طبع اول، مطبوعہ لاہور 1860ء، ص 112۔113

(3) انارکلی کے قصے کے حوالے سے، نور احمد چشتی نے اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی میں بیک وقت دو تین روایات پیش کرتے ہیں، جن میں سے کوئی بھی حقیقت کے قریب ترین معلوم نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ کہ: ''اب کوئی کہتا ہے کہ یہ مسموم ہو

کر ماری گئی، اور کوئی کہتا ہے کہ جب اکبر، مہم دکن پر گیا ہوا تھا تو یہ کسی مرض سے فوت ہو گئی، تو قبر اس کی پہلے بطور علی العموم بنائی گئی۔ جب بادشاہ واپس وہاں سے آیا تو خبر حیرتِ اثر انار کلی کے مرنے کی سنی، نہایت مغموم ہوا اور یہ مقبرہ بنوایا۔ مزید یہ کہ بقیہ تین قبروں کا حال یوں سنایا گیا کہ ایک تو اس کے ہم وطن یمن تھے اور دو خدمت گاریں تھیں۔ جب انار کلی بغیبتِ سلطان فوت ہو گئی تو ان دو کنیزوں نے خود کشی کی، خوف اور لحاظ سے، کہ اگر اس کے فوت کا حال بادشاہ سنے گا تو ضرور ہم کو تکلیف پہونچائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انار کلی مسموم ہوئی تو کوئی تعجب نہیں۔ ص112، 113

(4) گوہر نو شاہی مرتب یادگارِ چشتی مصنف نور احمد چشتی، مجلس ترقی ادب لاہور، اکتوبر 1975، ص79 5۔ دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد۔ ص53

(6) ایضاً۔ ص79

(7) مرزا حامد بیگ کے ناول کی کہانی کے مطابق 1591ء میں اکبر کو زہر دینے اور 1594ء میں حرمِ شاہی سے شہزادہ سلیم کے پکڑے جانے سے، اکبر کی مقرب کنیز انار کلی اس کی نظروں میں مشکوک ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 20 نومبر 1598 کو لاہور سے مالوہ، خاندیس کی طرف جاتے ہوئے اکبر نے بہ طور مدعی، میر عبدالحہ کی عدالت میں انار کلی پر زنا بالمحرمات کا مقدمہ دائر کیا تھا۔

(8) ابوالفضل عہدِ اکبری کا وہ معروف مؤرخ جس نے، عہدِ اکبری سے متعلقہ دو مشہور تواریخ 'آئینِ اکبری' اور 'اکبر نامہ' لکھیں۔

(9) آر۔ پی۔ ترپاٹھی، ڈاکٹر، مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال، مترجم، ڈاکٹر ریاض احمد خاں شروانی، بک کارنر جہلم، فروری 2016، ص304

(10) تحسین زہرا، جنوبی ایشیاء کے مسلم حکمران (712 سے 1857 تک)، اردو سائنس بورڈ لاہور، 2008ء، ص195

(11) ایضاً، ص195

(12) حامد بیگ، مرزا، 'انار کلی، ص80

(13) پروفیسر عرفان حبیب علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے سابق پروفیسر رہے ہیں، انھوں نے، سنٹر آف سٹڈی ان ہسٹری علی گڑھ یونیورسٹی کے، شہنشاہ اکبر کی شخصیت پر منعقدہ سیمینار 1992ء میں پڑھے گئے، انگریزی مقالات کو مرتب کیا، بعد ازاں اس کتاب کو سینٹ جوزف گورنمنٹ گرلز کالج کراچی، کے تاریخ کے سابق پروفیسر ریاض صدیقی نے اردو میں ''شہنشاہ اکبر'' کے نام سے 2018ء میں ترجمہ کیا۔

(14) ریاض صدیقی، پروفیسر، حرفِ اول، مشمولہ' شہنشاہ اکبر'، مرتبہ' پروفیسر عرفان حبیب'، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، 2018ء، ص14

(15) ایضاً، ص16

(16) حامد بیگ، مرزا، 'انارکلی'، ص69

(17) امتیاز علی تاج، سید، دیباچہ 'انارکلی'۔ ص5

(18) حامد بیگ، مرزا، 'انارکلی'، ص197

(19) ایضاً، ابتدائیہ، ص6

(20) ایضاً۔ ص24